

(قسط ۱)

اسرارِ میں

ممتاز مفتی

اسمارائیں

(افسانے)

ممتاز مفتی

سمیع اور اسما رہ

سمجھ اور اسرارہ کا واقعہ ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ایسا واقعہ جو اکثر ہمارے گرد و پیش چپ چاپ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، مگر نہیں دیکھتے، نہیں سنتے۔

سمجھ اور اسما رہ کوئی عجیب و غریب کردار نہیں ہیں۔ وہ بار بار مختلف کوائف سے مختلف ناموں میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم انہیں دیکھتے ہیں ان سے ملتے ہیں اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔

[illegible]

وایسے تو جگہ جگہ سمیع اور اسارہ ملتے ہیں لیکن ان مخصوص سمیع اسارہ کو دیکھنا ہو جن کا ذکر کرنے پر میں خود کو مجبور محسوس کر رہا ہوں اور جن میں کوئی خصوصی امتیاز نہیں تو کسی روز جمشیدی باغ کے مغربی حصے میں چلے جائیے۔ اس مقام سے ذرا دور جہاں تراشے ہوئے پودے پھولوں کے تختے اور تراشیدہ گھاس کے ہموار پلاٹ ختم ہو جاتے ہیں اور باغ جنگل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں بیٹھے بیٹھے سے سرسبز درختوں سے بھری ٹہنیاں خم کھاتی ہوئی بے تابانہ باہر نکل آتی ہیں جیسے کسی سے کچھ کہنے کے لیے بے قرار ہوں۔ اور پھر کچھ کہے بغیر بل کھائے جاتی ہیں۔ جہاں اونچی اونچی گھاس میں خاردار جھاڑیوں کے درمیان سرخ پتھر کا ایک فوارہ ہے جس کے گرد پتھر میں دو معصوم بچے مغموں میں ہیں اور نیچے ایک کتبہ کندہ ہے۔

”ہم دونوں کے سوا ساری دنیا عجیب ہے پیاری!“

”ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب۔۔۔۔۔“

اس فوارے کے گرد چند ایک ٹوٹے ہوئے بیج پڑے ہیں۔ فوارے کے پاس شاید آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے کیونکہ وہ دن ڈھلے وہاں آتے ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے آپ کو دیکھ پایا تو وہ چپ چاپ آگے نکل جائیں گے اور آپ کو معلوم ہی نہ ہوگا کہ وہی دونوں بیج اور اسما رہ تھے۔

اسارہ عمر میں پچیس کے لگ بھگ ہوگی اور سب سے قریب۔ ان کے خدو خال اور بشرہ سے کوئی خصوصیت نمایاں نہ ہوگی۔ اسارہ کی شکل و صورت ایسی ہوگی۔ جیسے تمام اساراؤں کی شکل و صورت ہوتی ہے۔ کتابی چہرہ ستواں ناک، پتلے ہونٹ، تنگ دہن اور اداس، نیم واڈھتی آنکھیں۔

اس کے چہرے پر ایک مخملی سی زردی، ایک غم زدہ تازگی نمایاں ہوگی۔ جیسے کوئی پھول اوس کی نمی تلے اور بھی شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔ آرزوگی کی اس گہری اور شگفتہ تہہ کے علاوہ اس کے چہرے پر کوئی اظہار نہیں ہوتا، جیسے اس حسن افزا غارے نے اسے باقی جملہ اظہار سے محروم کر دیا ہو۔ اور اس کے جذبات اظہار کے راستے مسدود پا کر چہرے سے ہاتھوں میں اتر آئے ہیں۔

سمج کی شکل عام سی ہے۔ جیسے آپ کی میری یا کسی اور کی۔ اور سچ پوچھے تو ہم اور سمج میں فرق ہی کیا ہے۔ یہی ناکہ ہمیں کوئی اسارہ نہیں ملی۔ جو ہمارے خوابیدہ سمج کو چونکا دیتی اور پھر اسے تھپک تھپک کر پالستی پوتی۔ اس سمج کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ کھو گیا ہو کسی کی تلاش کرتے ہوئے خود کہیں کھو گیا ہو جیسے اس کے گرد و پیش کی تمام چیزیں سو گئی ہوں اور فاصلے انگڑائیاں لینے لگے ہوں۔ اور ہواؤں نے چلنا چھوڑ کر تھپکنا شروع کر دیا ہو۔

نوارے کے قریب آ کر وہ دونوں رک جائیں گی۔ سمیع کھوئی ہوئی، تھکی ہوئی نگاہ ادھر ادھر ڈالے گا۔۔۔۔۔ اسارہ کے سیاہ برقعے سے دوزرہ مخملی سانپ نکل آئیں گے اور یوں مضطربانہ لہرانے لگیں گے جیسے کچھ ٹٹول رہے ہوں۔

”اسمارہ!“ سمیع کی کراہ سنائی دے گی۔

”جی“ فضا میں ایک ہلکی سی آہ تیرنے لگے گی۔

“اسمارت!”

“جی!”

”تم تھک گئی ہو اسارہ؟“

”نہیں تو“ اور اس کے ٹھکے ہوئے بے جان ہاتھ بیچ کا سہارا لینے کے لیے آگے بڑھیں گے۔

”ضرور تم تھک گئی ہو، کچھ دیر بیٹھ جائیں۔“

”اچھا“۔۔۔۔۔ اسارہ دھم سے بچ پر گر جائے گی جیسے وہ تھک کر چور ہو چکی ہو۔ سبج ارد گرد کھوئی ہوئی نگاہ ڈالے گا، سرد آہیں بھرے گا اور پھر اسی بچ پر اسارہ سے پرے ہٹ کر بیٹھ جائے گا۔ اور وہ دونوں خاموش بیٹھے رہیں گے۔ اسارہ برقع اٹھا کر

فوارے کی طرف منہ موڑ لے گی اور کچھ اس انداز سے فوارے اور کتبے کی طرف دیکھے گی۔ جیسے وہ فوارے کے وجود سے ہی واقف نہ ہو، جیسے وہ کتبہ فوارے کی بجائے افق پر رنگین بادلوں میں کندہ ہو۔ سمجھ ان بل کھاتی ہوئی مضطرب شاخوں کی طرف چوری چوری دیکھتا رہے گا جو اس سیاہ جھاڑی سے نکل کر فضا میں ایک جمالی انداز سے معلق ہوگی۔ سمجھ کی مضطربانہ نگاہوں کو دیکھے بغیر محسوس کر کے اسامہ کی انگلیاں تن کر اور بھی لمبی ہو جائیں گی اور قریب ہی مخملی زرد سانپوں کی زبانیں یوں لہرائیں گی جیسے کسی ضحاک کے شانے ٹٹول رہی ہوں۔

یہ دیکھ کر سمجھ اور بھی سمٹ جائے گا۔ اور اسامہ سے ذرا پرے سرک کر آہ بھرے گا۔

”اسامہ!“

”جی“

”اسامہ میں گردن زدنی ہوں۔“

”کیوں؟“

”میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی۔“

”نہیں تو“

”سب میرا قصور ہے، سب میرا قصور ہے۔“

باغ کے اس ویران ٹکڑے میں ایک آہ اور ایک کراہ تیرنے لگیں گی۔ ”میری محبت میں تمہاری تباہی کا باعث ہوئی۔“

”نہیں تو۔“ پتھر کے معصوم بچے کو دیکھ وہ پیار سے مسکرا دے گی۔

پھر وہ اٹھ بیٹھے گا اور مضطربانہ ٹہلنے لگے گا۔ اور اسامہ کی زرد شاخیں بل کھائیں گی اور اس کے چہرے کی آزر دگی اور بھی شدید ہو کر اسے ایک نئی تازگی بخش دے گی۔

پھر نہ جانے کہاں سے راز آ نکلے گا۔ وہ حیرانی سے سمجھ اور اسامہ کی طرف دیکھے گا۔ ”ہیں تم۔۔۔۔۔۔ تم یہاں؟“

”ہاں“ سمجھ اسامہ سے اور بھی دور ہٹ جائے گا۔ اور دوسرے بچے پر بیٹھ کر اسے اپنی طرف بلائے گا۔ ”راز آؤ“ تم جانتے ہو سب قصور میرا ہے۔ سب قصور میرا ہے۔ میں نے اسامہ کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا۔ میں نے اسے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ میں گردن زدنی ہوں راز“

”گردن زدنی“ یہ کہتے ہوئے وہ سردو نوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں بند کر لے گا۔

”راز۔۔۔۔۔“ اسارہ اسے اشارے سے بلائے گی۔ ”ان کا قصور نہیں، ان کا قصور نہیں راز۔ سب میری بدقسمتی ہے۔ میری بدقسمتی! میں کتنی بدنصیب ہوں راز، تم جانتے ہو۔ ان سے جا کر کہہ دو۔ وہ میرا غم نہ کھائیں۔ میرے لیے اپنی زندگی تباہ نہ کریں۔“

سمیع راز کو پاس کھڑا دیکھ کر چونکے گا۔ ”راز کتنی اچھی ہے وہ کتنی پاکیزہ! لیکن میں‘ میں اس کے قابل نہیں‘ قطعی نہیں۔ اس نے اپنی پاکیزگی سے میری زندگی سنواری۔ اور میں نے اسے کیا دیا؟ کچھ بھی نہیں۔ تباہی بربادی، تنہائی، جاؤ راز اسے کہہ دو کہ سمیع ساری عمر آنسو بہاتا رہے تو بھی اس گناہ کی تلافی نہیں ہو سکتی۔“

پھر اس سیاہ جھاڑی سے دو زرد شعلے سے نکل کر راز کو جھلس دیں گے۔ زن ایک پٹاخہ سا چھوٹے گا اور راز کا سر کٹ کر درخت کی شاخ سے جالٹے گا۔ ایک کراہ اور ایک آہ ان بچوں کے گرد آنکھ مچولی کھیلیں گے۔ اور شاخیں بل کھا کھا کر سبز پتوں سے جھانکیں گی اور شام اپنا دھندلا پردہ کھول دے گی۔

جشنی باغ کے اس ویران کونے میں سمج اور اسامہ ہر اتوار کو آتے ہیں اور فوارے کے قریب رک جاتے ہیں۔ ”اسامہ!“ سمج آنسو پی کر کہتا ہے۔ ”جی“ ایک محملی آہ فضا میں تیرتی ہے اور اسامہ کی نیم وا کشتیاں ڈولتی ہیں، ہاتھ بل کھاتے ہیں۔ اور اس کے چہرے پر آ زردگی کی تہ اور بھی گاڑھی ہو کر اسے ایک انوکھی تازگی بخش دیتی ہے اور پھر اشفاق سے سمج کا دوست راز اوہرا نکلتا ہے اور سمج اٹھ کر دوسرے بچ پر جا بیٹھتا ہے۔ ”راز اسے جا کر کہہ دو۔“

اور سیاہ جھاڑی سے دوزر دسانپ نکل کر راز کے شانے چاٹتے ہیں اور اس کا سر شاخ سے لٹکنے لگتا ہے اور فوارہ اچھل اچھل کر جھانکتا ہے۔ اور بچے مسکراتے ہیں اور ان کے نیچے وہ کتبہ پھیلنے لگتا ہے اور شام کے دھندلکے میں اس کے حروف خون آلود سرخی سے چمکتے ہیں اور دور افق پر ان کا عکس پڑتا ہے اور بادلوں کو آگ لگ جاتی ہے اور فضا میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں گونجتی ہیں۔

”ساری دنیا عجیب ہے پیاری!“

”ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب!“

دس سال گزرے جب سمیج نے پہلی بار اسماہ کو دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ دس سال! اسماہ اس وقت حسب معمول باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ مصروف کار تھے۔ اس کی نگاہیں یوں کھوئی ہوئی تھیں جیسے کائنات کے خلا اور وسعتیں ان آنکھوں دو آنکھوں میں جذب ہو چکی ہیں۔ اس کے ہونٹ یوں بھنجے ہوئے تھے جیسے کراہ کو دبائے ہوئے ہوں۔ اس کے رخساروں پر مخملی زردی

کی تازگی تھی وہ یوں بیٹھی تھی جیسے سبھی اسارا میں بیٹھتی ہیں۔ مگر سمیع نے کبھی کسی اسارہ کو نہ دیکھا تھا۔ اس لیے وہ اسے دیکھ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اسارہ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی خالہ کی نند کے بھائی کا نووارد بیٹا قریب ہی حیرانی اسے اسے دیکھ رہا ہے۔ لیکن اسارہ نے دوپٹہ سنبھالنے یا گھبرا کر پیچھے ہٹنے یا ہائے اللہ کہہ کر بھاگنے کی کوشش نہ کی تھی، جیسے نو جوان لڑکیاں کیا کرتی ہیں بلکہ سمیع کی موجودگی کے احساس پر اس کے رخسار اور بھی شبنمی ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی کشتیاں اور بھی ڈولنے لگی تھیں اور اس کے ہونٹ اور بھی کراہنے لگے تھے۔

اس روز کے بعد سمیع میں ایک اضطراب سا جاگ اٹھا۔ بے نام اندھا اضطراب دفعتاً وہ پڑھتے اٹھ بیٹھتا اور کتاب میز پر دے مارتا۔ ”نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔“

راہ چلتے ہوئے وہ چونک پڑتا۔ ”نہیں، نہیں، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“
 ”گھر آ کر وہ چپکے سے گھومتی ہوئی سیزھیاں چڑھ جاتا اور باورچی خانے کی اس کھڑکی کے قریب جو اندر دالان میں کھلتی تھی۔ دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اسارہ کو دیکھتا رہتا۔

نہ جانے کیسے اس کی آمد پر کھڑکی کی طرف دیکھے بغیر اسے احساس ہو جاتا کہ وہ آ گیا ہے۔ اس پر اس کی بھنویں اور بھی تن جاتیں۔ چہرہ اور بھی ستا ہوا دکھائی دیتا اور ہاتھ دلفریب خم کھا کر جمالی انداز سے ہوا میں معلق ہو جاتے، پھر روز بروز اسارہ کی اس چوکی کا زاویہ بھی بدلتا جا رہا تھا جس پر وہ بیٹھا کرتی تھی اور اس کا چہرہ گلی کی کھڑکی کی سمت غروب ہوتا ہوا دالان کی کھڑکی پر طلوع ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسارہ نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کھڑکی کی طرف نہ دیکھا تھا۔ جس کی اوٹ میں سمیع کھڑا ہوتا تھا۔

سمیع چوری چوری اسارہ کی طرف دیکھتا، آہیں بھرتا، آہیں بھرتا اور ہلکی سی آہٹ پر دیوار پر لگے بجلی کے سوچ کی مرمت میں یوں مشغول ہو جاتا۔ جیسے اسے خبر ہی نہ ہو۔ اور اسارہ آلو چھیلی چھیلی، ٹماٹر کٹتی، چائے بناتی اور پھر جیسے تھک کر انگڑائیاں لیتی اور بیٹھتے ہوئے یوں دیواروں کے پار خلاؤں کو گھورتی جیسے اس کائنات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ سمیع آہیں بھرتا بھرتا تھک جاتا تو چپکے سے سیزھیاں اتر جاتا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر کتابوں کو گھورتا، میز سے لڑتا اور جملہ چیزوں کے خلاف شکایتیں کرتا۔ ”اب میں کیا کروں؟ اب میں کیا کروں؟“ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں صحرانوردی کرتے ہوئے چلاتا۔ ”مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔“

اسارہ کے والد کالج میں پروفیسر تھے۔ جنہیں کتابوں کے علاوہ جیتے جاگتے مطالعوں میں دلچسپی تھی۔ لیکن اسارہ کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی دلچسپی صرف کتابوں تک ہی محدود رہ گئی۔ شاید اس خیال سے کہ گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے

مطلوع کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ لیکن کسی پلے ہوئے تو ارٹھی رجحان کو پس پشت ڈالنے سے وہ انتقامی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایسا شبنون مارتا ہے کہ انسان کا ذہنی توازن تباہ ہو جاتا ہے۔ پروفیسر قائم علی بھی ایک ایسے ہی شبنون کا شکار ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوسی سب حج کی بیگم شرقی ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر پروفیسر صاحب کے گھر میں آ بیٹھی تھی اور اس کی آمد پر پروفیسر صاحب نے کتابیں پڑھنے کا شغل ترک کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی تازہ فتح بیگم شرقی میں کھو گئے تھے۔

سمیع جب گاؤں سے شہر آیا تاکہ تھرڈ ایئر میں داخل ہو تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہوا کہ ایک حساب سے وہ ان کا رشتہ دار ہے اور انہوں نے اسے رکی دعوت دی۔ ”سمیع! جب تک رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو تو ہمارے ہاں آ ٹھہرو۔“ اور جب سمیع کتابوں کا سوٹ کیس اٹھائے وہاں پہنچ گیا تو پروفیسر صاحب اس کے وجود اس مکان میں اس کی موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ ہو گئے۔ ایک تو وہ ویسے ہی نسیان کا شکار تھے جیسے عام طور پر پروفیسر ہوتے ہیں اور دوسرے بیگم شرقی کی فتح نے انہیں عام فانی انسانوں کی باتوں اور واقعات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ انہیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ خواب گاہ کے قریب ہی باورچی خانے میں ان کی دو جوان لڑکیاں آلوچھیلنے منہ پر کوئی چھڑکنے اور بے کام کئے تھک کر انگڑائیاں لینے اور معصومانہ انداز میں کھڑکیوں میں لٹکنے میں مصروف ہیں اور دالان میں ساری دو پہر ان کا نووارد مہمان بچی کا سوچ بچ بنانے میں مصروف کار رہتا ہے جسے دیکھے بغیر اسما رہ کی موجودگی محسوس کر کے مٹاڑ کاٹنے میں شدت سے مصروف ہو جاتی ہے اور پھر اس کی نگاہیں اس چار دیواری سے باہر خلاؤں کو گھورتی ہیں۔ اس کے گالوں پر گزشتہ آنسوؤں کی نمی عود کر آتی ہے۔ اس کے ہونٹ یوں بند ہو جاتے ہیں جیسے ہچکی روک رہی ہو۔ اور سمیع کا بند بند شدید اذیت کے زیر اثر تڑپتا ہے۔ اس کی نسیں تن جاتی ہیں اور رگیں پھڑپھڑاتی ہیں۔۔۔۔۔ اور پھر وہ گہرا کر نیچے کو بھاگتا ہے اور اپنے کمرے میں پہنچ کر چلاتا ہے۔ ”اب میں کیا کروں؟ اب میں کیا کروں؟“ اور پھر اسما رہ چلتے چلتے رک جاتی ہے اور کان لگا کر سمیع کی آوازیں سنتی ہے اور اس کے ہونٹوں کی کراہ مسکراہٹ میں بدل جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں خلاؤں کی جگہ آبادیاں نظر آتی ہیں۔ اور مخملی زردی میں اطمینان کی ہلکی سی سرخی اس کے رخساروں میں جھلکتی ہے۔

پھر ایک روز جب سمیع اپنے کمرے میں صحرانوردی کرتے کرتے اور ”میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، نہیں کر سکتا“ کہتے کہتے بارگیا تو وہ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ آیا اور دالان میں سوچ بچ بنانے کے لیے رکنے کی بجائے سیدھا باورچی خانے میں داخل ہو گیا اور اسما رہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اسما رہ کی چھوٹی بہن حسن آرانے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھٹھکی اور پھر لپک کر کھڑکی میں لٹک گئی اور جھک کر نہ جانے کیا دیکھنے میں یوں کھو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جیسے سمیع اسما رہ کے روبرو کھڑا ہی نہ ہو۔

ایک ساعت کے لیے اسارہ کے ہاتھ کا پنے نہ جانے تعجب یا خوشی سے۔۔۔۔۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی اور منہ موڑ کر میز کے قریب کھڑی ہو گئی۔

”نہیں اسارہ! نہیں“ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ یہاں سے جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لیے۔“ وہ غصے میں چلایا۔ ”اچھا۔۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ اور اس کی نگاہوں میں تمام خلا از سر نو جذب ہو گئے۔ اس کے ہونٹ اور بھی بند ہو گئے۔ اس کا چہرہ اور بھی ست گیا اور بال منہ پر ڈھلک آئے اور سیاہ بالوں میں وہ مخروطی چہرہ یوں دکھائی دینے لگا، جیسے کوئی چراغ سہری جھلملا رہا ہو۔

خدا کے لیے اسارہ خدا کے لیے۔۔۔۔۔۔ اس گھر کو چھوڑ دو۔ چلی چلو۔ بھاگ چلو اس گھر سے جہاں باپ کو بیٹی کے وجود کا بھی احساس نہیں، جہاں کسی کو احساس نہیں کہ لڑکی کی جوانی ٹماٹر کا ٹٹے میں بیٹی جا رہی ہے۔ جہاں تغافل حکمران ہے۔ بھاگ چلو اسارہ!“

”کہاں؟“ وہ بولی، جیسے دور کسی نے ہچکی لی ہو۔

”کہیں جہاں بھی جگہ ملے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس تغافل کو برداشت نہیں کر سکتا، نہیں کر سکتا۔ بولو۔ اسارہ!“

”برداشت“ اس کے ہونٹ ہلکی مسکراہٹ سے ملے۔

”نہیں نہیں“ وہ چیخنے لگا۔ ”تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ بالکل نہیں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ ورنہ میں چلا جاؤں گا“ ہمیشہ کے لیے۔ یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”ہوں!“ باورچی خانے میں ایک آہ تیرنے لگی۔ ”آپ کسی کے لیے کیوں دکھی ہوں۔ جائیے۔“

”یہ سن کر سمج خاموش ہو گیا“ جیسے اس کے منہ میں زبان نہ رہی ہو۔ جیسے اس کی طاقت گویائی چھن گئی ہو۔ اس کے گرد ایک دھندلکا پھیل گیا۔ پھر وہ دھندلکا صاف ہو رہا تھا۔ باورچی خانے کی دیواریں واضح ہوئی جا رہی تھیں۔ چولہا، نعمت خانہ کھڑکی میں لٹکی ہوئی حسن آرا۔ اور بالآخر میز کے پاس کھڑی اسارہ اور وہ چونکا۔ ”میں کہاں ہوں“ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ معاف کرنا میں۔۔۔۔۔“ اور پھر چپ چاپ باورچی خانے سے باہر نکل، سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں بستر پر گر کر بڑبڑانے لگا۔ ”نہیں نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا، نہیں جاسکتا۔“

”اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ دالان میں محراب تلے، سیڑھیوں میں، کوٹھے پر دودکش کی اوٹ میں اور

بال آخر سمیع کے چھوٹے کمرے میں ہر بار ملاقات پر وہ دیر تک انتظار کرتا رہتا اور جب مایوس ہو جاتا تو ہاتھ میں کشیدہ اٹھائے یا کوئی چیز سنبھالے اسمارہ چپکے سے ادھر آ نکلتی جیسے اتفاق سے آ گئی ہو۔ وہ یوں خاموش اور دبے پاؤں آتی تھی جیسے سورج کی پہلی کرن چپ چاپ کھڑکی کی درز سے داخل ہو کر اپنی آمد کا اعلان کئے بغیر فرش پر کھیلنے لگتی ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ داخل ہو چکی ہے۔

دفعۃً سمجھ کو احساس ہوتا کہ وہ آچکی ہے اور اس کے اس قدر قریب کھڑی ہے۔ اس پر وہ سرک کر پرے ہٹ جاتا۔ ”اسمارہ تم؟“

”جی“ ایک آہ اس کے کانوں پر منڈلاتی۔

”تم کتنی دکھی ہو اسما رہ؟“

اسمارہ کے ہونٹ اور بھی سمٹ جاتے۔

”میں تمہیں اس مصیبت سے کس طرح بچا سکتا ہوں اسامارہ؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ قریب ہی کوئی کالی چٹکتی اور بند ہو جاتی اور ایک مدہوش کن خوشبو چھوڑ جاتی۔

”میں کیا کروں، اسما رہ کیا کروں؟“ وہ گویا اپنے آپ سے کہتا اور پھر اس کے جسم کا بند بند چٹخنا اور اس کی نیس انگڑائیاں لیتیں۔

”آپ میرے لیے اتنے دکھی ہیں؟“

”نہیں نہیں“ وہ چونک پڑتا۔ ”میں دکھی نہیں ہوں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے مجھے۔“

”جیسے جیسے۔۔۔۔۔ اب میں کیا بتاؤں، اس بارہ کیسے بتاؤں، سمجھ میں نہیں آتا۔“

”جیسے جیسے تمہارا دکھ میری-----میری-----جیسے وہ میری زندگی ہو۔ نہیں نہیں، جیسے، جیسے مجھے معلوم نہیں، مجھے

معلوم نہیں، تم اتنی پیاری کیوں ہو! اسمارہ؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ اس کی کمانیں تن جاتیں، کشتیاں ڈولتیں۔

”میری زندگی میں ایک روشنی سی ہو گئی ہے۔ زرد چاندنی سی مٹلی سنہری روشنی؟ کیوں؟“ وہ رک گیا۔ ”جانتی ہو؟“

”میں کیا جانوں؟“ اس کی تاک افق کی طرف اشارہ کرتی اور انجانے میں سرک کر وہ اس کے قریب تر ہو جاتی۔ اگر اس وقت وہ

دونوں سحیح کے کمرے میں ہوتے تو اس قدر قریب ہو جاتی کہ سحیح کے گرد ایک زرد مٹلی ہالہ بن جاتا گھبرا کر سحیح پیچھے ہٹنے لگتا تو انسان کا گال مٹلی زردی یر تک جاتا۔

”تم کس قدر دکھی ہو! اسمارہ؟“

نکاح کی رسم کے اختتام کے بعد وہ واپس آ گیا۔ لیکن اب وہ قائم علی کے گھر نہ جاسکتا تھا۔ کیونکہ رخصت کرتے وقت ماں نے صاف کہہ دیا تھا۔ ”وہاں نہ ٹھہرنا بیٹا! لوگ کیا کہیں گے۔ گاؤں والوں نے تو پہلے ہی ہمارا جینا محال کر رکھا ہے۔“ اماں نہ بھی کہتی تو وہ وہاں نہ جاسکتا تھا۔ کس منہ سے جاتا وہاں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مکان، وہ دالان، وہ زینہ اور وہ کمرہ اس پر انگلیاں اٹھا رہے تھے۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہی ہے وہ!“

اسٹیشن سے اتر کر وہ سیدھا بورڈنگ پہنچا اور اپنے کمرے میں دھم سے چار پائی پر گر گیا۔ ”میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ اور برداشت کرنے کی شدید کوشش میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ایک روز جب وہ کتابوں، الماریوں اور کھڑکیوں کو بہ آواز بلند برداشت نہ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ تو اس کا پڑوسی دوست راز چپکے سے اطلاع کئے بغیر اندر آ گھسا۔

”تمہاری قوت برداشت کے کیا کہنے ہیں، سمج!“ راز نے ہنس کر کہا۔

”ہائیں تم؟“ سمج گھبرا گیا۔

”اس احتجاج کے باوجود تم برداشت کئے جا رہے ہو۔“

”نکل جاؤ میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ۔“ وہ چلایا۔ ”میری اجازت کے بغیر تمہیں اندر داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی؟“

”تمہاری قوت برداشت پر مجھے اعتماد ہے۔“ راز کی آواز میں بلا کی طنز تھی۔ سمج اس کی طرف جھپٹا اور پھر پھر نہ جانے کیا ہوا۔

دفعۃً وہ رکا اور راز کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ”اس نے مجھے پاگل کر دیا ہے راز! پاگل کر دیا ہے۔ لیکن کتنی پیاری ہے وہ کتنی پاکیزہ راز۔ صرف ایک بار راز، صرف ایک بار! مجھے اس سے ملا دو۔۔۔۔۔ صرف ایک بار۔“ اور پھر کئی دن تک سمج کے کمرے میں منتوں کی آواز آتی رہی۔ ”صرف ایک بار۔“

اور راز کی وساطت سے وہ دونوں ایک بار ملے، اسی جشی باغ میں، فوارے کے قریب۔

اس روز مطلع غبار آلود تھا۔ آسمان پر ٹھیلے بادلوں کی دھول اڑ رہی تھی۔ ہوا میں مٹی کے ذرات آوارہ تھے۔ زرد ٹہنیاں سرسبز پتوں کو تھپک رہی تھیں۔ فوارہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہا تھا۔ اور وہ پتھر پلے معصوم بچے ایک دوسرے سے منہ موڑے بسور رہے تھے۔ اور فوارے تلے اسارہ کمان تانے بیٹھی تھی اور دوسرے بیچ پر سمج بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اور دونوں بچوں کے درمیان راز سرگرداں تھا اور خمیدہ ٹہنیاں مڑ مڑ کر جھانک رہی تھیں اور لمبی گھاس کے زرد ڈنٹھل سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور باغ کی روشیں دور دور سے آ کر ان

کے گرد و حلقہ کئے ناچ رہی تھیں۔

”اس سے کہہ دو راز میں گردن زدنی ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ گنہگار ہوں۔ لیکن نہیں! اس سے کچھ نہ کہو۔ مجھے اب اسے پیغام بھیجنے کا کوئی حق نہیں۔“

”نہیں نہیں، راز اس سے کہہ دو میری صرف ایک بات مان لے۔ میری آخری التجا۔ آخری اسے کہہ دو کہ وہ مجھ سے نفرت کرے۔ نفرت، میں اسی قابل ہوں اسی قابل۔ سمجھ نہ جانے کیا بڑا راز ہاتھا۔ اور راز حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دو کھنچی ہوئی کمانیں۔ ڈوبتی کشتیاں۔ ایک بجھا بجھا ساز رد مگر جھلس دینے والا شعلہ۔ اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں ہے، کون ہے، کیوں ہے۔ ایک مدہوشی، ایک مسلسل دھنکی، مدہم مگر پیہم اور وہ ٹپ ٹپ کرتے آنسو۔ پتھر کے سرخ کٹورے سے گرتے ہوئے آنسو اور وہ درختوں، پتوں، ٹہنیوں کا دھندلا اور اس میں کمان کی طرح کھنچی ہوئی وہ زرد مچلی پر نرم قوس۔ دفعتاً دوزرد بازو سیاہ ریشمیں درخت سے بل کھاتے ہوئے نکلے اور اس کی طرف بڑھے۔ اس کے شانے چاٹنے لگے جن کے لمس سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور گردن سے تراخی سی آواز آئی۔ اور اس کا سر کٹ کراڑا اور شاخ سے لٹکنے لگا۔ اور دفعتاً اس حیران کن طلسمی منظر میں ایک مفہوم پیدا ہو گیا۔ وہ ویرانہ آباد ہو گیا۔ اور اس گھٹے گھٹے ماحول میں کائنات کی وسعتیں انکڑا پٹیاں لینے لگیں۔

پھر فضا میں ایک رنگین آہ گونجی۔ ”ان سے کہہ دو اور وہ میرا غم نہ کھائیں۔“

”نہیں نہیں“ پاس ہی سمج کی آواز گونجی۔ راز نے بھد شکل سراٹھایا۔ اسارہ پر سمج جھکا ہوا تھا۔ ”نہیں نہیں“ میں تمہارے سامنے نہیں آ سکتا۔ تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا۔ میں مجرم ہوں، تمہارا مجرم۔۔۔۔۔ ان آنکھوں کو نکال دو اسارہ!“ اس نے اس کا بازو کھینچ کر اپنے منہ پر رکھ لیا۔ نکال دو اس سر کو کاٹ دو جو تسلیم میں خم ہو گیا ہے۔ سمج کا سر جھک کر اسارہ کی گود میں ڈھیر ہو گیا جیسے کٹ گیا ہو۔ پتھر کے معصوم بچے تالیاں بجانے لگے۔ زرد مٹی قوس نے بھورے بادل کو تھام لیا اور شام نے اپنے سیاہ پردے کھول دیئے۔

بھروسہ دونوں باغ میں ملنے لگے۔

اسارہ سیر کی غرض سے اتفاقاً ادھر آ نکلتی اور فوراً رے کے قریب پہنچ کر تھک جاتی اور بچ پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگتی اور سمیع دوسرے بچ پر بیٹھ کر فلکیات کی کتاب کھول لیتا۔ پھر اتفاق سے راز آ پہنچتا جسے دیکھ کر اسارہ کی انگلیاں اور بھی تیز ہو جاتیں۔ اور کمانیں اور بھی تن جاتیں اور سمیع حیرانی سے چلاتا۔ ”تم راز؟ تم یہاں؟“ اور راز کے شانوں کو سانپ چاٹتے اور اس کا سر بھن سے اڑ جاتا جیسے پٹاخے کو آگ دکھادی گئی ہو۔ اور پھر درخت کی بل کھاتی ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے وہ پتھر کے ان معصوم بچوں کی مدھم سرگوشیاں سننا۔

”ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب۔۔۔۔۔“

پھر وہ دونوں چپ چاپ بورڈنگ پہنچتے۔ راز اور سمیع۔ اور سمیع چلانے لگتا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اس کی ویرانی۔ اس کی تنہائی۔ میں خود تلاش کروں گا۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا۔ جسے اسما رہ حاصل ہو جائے گی۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا۔ کتنی پاکیزہ ہے وہ کتنی بلند کتنی معصوم !!!

بال آخر وہ دن آ گیا جب وہ اس خوش نصیب کو دیکھ سکتا تھا۔ جسے اسارہ حاصل ہو رہی تھی۔ وہ اس کے بدن کو چھو سکتا تھا اس کی زردگار چلی کو تھام سکتا تھا جو رکاب میں لگی ہوئی تھی۔ کتنی خوبصورت چلی تھی وہ اور اس کے دو بڑے بڑے سے ہاتھ جن میں گھوڑے کی لگام تھامی ہوئی تھی۔ ان ہاتھوں کو اسارہ کو چھونے، اسے تھامنے اور تھپکنے کا حق حاصل ہونے والا تھا۔ ان پاؤں کو اس کی طرف چل کر جانے کی آزادی مل رہی تھی۔ لیکن وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا جسے پھولوں کی لمبی لمبی لڑیاں ڈھانپے ہوئے تھیں۔ ”شکر ہے راز، وہ چلایا، شکر ہے۔ نغمے کو سامع مل گیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ کاش میں اس خوش نصیب کا چہرہ دیکھ سکتا۔“

لیکن چہرہ دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا۔ اس نے ایک جھرجھری محسوس کی، ایک نفرت بھری جھرجھری۔ اور وہ راز کی طرف بھاگا۔ ”راز! وہ۔۔۔۔۔ وہ ہانپ رہا تھا۔“ وہ تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ خون سے بھرا ہوا لوتھڑا۔ ایک روغنی طنبورہ جس میں کوئی تار نہیں جو تاروں سے واقف ہی نہیں۔ وہ ایک جھوم ہے راز ایک شور و غل سے بھرا ہوا جھوم، وہ تنہائی اور خاموشی کے نعمات سے بے بہرہ ہے۔ راز میں مجرم ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ میں نے اسے تباہ کر دیا، تباہ کر دیا۔“ اور پھر کئی ایک دن اس کے کمرے سے آہوں اور کراہوں کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر کمرے سے بہ آواز بلند فلکیات کا ورد سنائی دینے لگا جیسے کوئی رورہا ہو، چیخ رہا ہو۔ کائنات سے شکایت کر رہا ہو اور پھر اس کے لیے کمرے میں بند رہنا ناممکن ہو گیا اور وہ حبشی باغ کے اس کونے میں بیٹھ کر فلکیات کا ورد کرنے لگا۔ ”ہائیں،“ مخملی آہ سن کر وہ چونکا، سامنے بیچ پر اسارہ بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”تم! تم یہاں!!! تم چلی جاؤ۔ یہاں سے چلی جاؤ۔“ وہ اس کی طرف جھپٹا۔ ”چلی جاؤ، تم کسی اور کی ہو۔ تمہیں یہاں آنے کا کوئی حق نہیں۔“ اور اسارہ کی کمانیں تنی رہیں، کشتیاں ڈوبتی رہیں اور وہ چپ چاپ سویٹر بننے میں مصروف رہی۔ وہ چلا تارہا۔

حتیٰ کہ تھک گیا۔ اس کی گردن جھک گئی اور لٹکتے لٹکتے مخملی زردی کی جھیل میں ڈوب گئی اور دوسنہرے بازو نکل کر اسے تھامنے میں مصروف ہو گئے۔ ”آپ میرا غم نہ کھائیں، میرا غم نہ کھائیں آپ“ اور پھر آہستہ آہستہ فضا پر خاموشی چھا گئی اور اس خاموشی کے نغمے سے بے خود ہو کر پاس والی جھاڑی سے راز باہر نکل آیا اور اس میں تنی ہوئی کمان کے روبرو مجرم کی طرح بیٹھ گیا۔ ”تم ان سے کہہ دو

راں ٹیاں

”ہائیں۔۔۔۔۔! پھول دار لہنگے والے نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا ”سچ؟“
 ”ہاں“ بڈھے نے داڑھی جھاڑ کر کہا۔ ”سب کا رکھ رکھاؤ اکیلی کرے ہے وہ بدراں۔“
 ”گھر میں کوئی نہیں کیا؟“

”سبھی کھیت پر رہیں ہیں۔ بھائی، باپو چاچا۔۔۔۔۔ ساری بستی میں چار ایک مرد ہوں گے۔ ویسے تو آتے جاتے رہتے ہیں
 ہفتے میں ایک بار۔“

”اچھا“ نو جوان ہنسا۔۔۔۔۔ ”معلوم ہوتا ہے انہیں کوئی ملا نہیں۔“

بڈھا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”میاں یہ راں ٹیاں ہے۔۔۔۔۔ راں ٹیاں سمجھے۔۔۔۔۔؟“ وہ پھر ہنسنے لگا۔ اپنے چودھری کا گھر
 سونے سے بھرا ہے۔ پریوں سمجھو جیسے مندر میں مورتی۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ لودہ ریا کنواں۔ درختوں کے اس
 جھنڈ میں ہے۔ پی لو پانی جا کر اس جھنڈ میں۔ اللہ بلی۔“ یہ کہہ کر بڈھا ڈنڈی پر اتر گیا۔

”بدراں۔۔۔۔۔!“ نو جوان مسکرا دیا۔ لہنگا سوار کر مونچھوں کو تادیتے ہوئے زیر لب بولا ”راں ٹیاں کی بدراں۔“

”راں ٹیاں ہو اوراں ٹیاں آں آں۔“

دور کہیں سے پہاڑی کی تان سنائی دی۔

”جس جاں ٹیاں اوس نہ ماں ٹیاں۔ جس ماں ٹیاں اُن جانڑیاں۔“

”راں ٹیاں۔ ہو اوراں ٹیاں۔ آں آں۔“

چناب کے شمال مغرب میں چلے جاؤ تو پتن وال سے آگے درختوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور قد چھوٹا۔ درختوں کے جھنڈ اور
 گاؤں سرک سرک کر دور ہٹتے جاتے ہیں۔ زمین پتھر ملی ہوتی جاتی ہے اور مٹی کا رنگ لاکھا۔ یہ علاقہ پلچھی کا ہے جس کے عین وسط میں
 راں ٹیاں کا گاؤں آباد ہے۔

گاؤں کے ارد گرد خود رو گلابڑی کی جھاڑیاں دیکھ کر یقین نہیں پڑتا کہ اس زمین میں کاشت کرنے کے لئے اس قدر مشقت کی

ضرورت پڑتی ہوگی، لیکن وہاں کے مردوں کو دیکھ کر اجنبی راہ گیر ایک ساعت کے لئے رک جاتے ہیں۔ اونچا لمبا قد، ابھرتی چھاتی، فراخ شانے، پٹھوں میں موروثی جدوجہد کا تناؤ، آنکھ میں رد عمل کی جھلک۔۔۔۔۔۔ شاید کامیابی۔ اور عورتوں کو دیکھ کر بھی دیکھتے انہیں۔ چونکہ وہ پردہ و پردہ نہیں جانتیں، لیکن وہی تناؤ، قد و قامت۔ شاہانہ چال، نڈر آنکھیں جو شرما کر کسی دعوت دینے کے فن سے بیگانہ ہیں اور بھرا بھرا انبیاء جسم گھبرا کر یا سٹ کر راہ گیر کی توجہ اکسانے سے بے نیاز ہے ان کی آنکھ چھلکی ہوئی ہونے کے باوجود چھلکتی نہیں۔ سرخ ہونے کے باوجود گال شرم سے متمتاتے نہیں۔ شاید راں ٹریاں کے مردوں نے ان کے نسوانی پہلو کو عریاں دیکھا ہو۔ لیکن اجنبی۔۔۔۔۔۔ اجنبی کو تو وہ یوں دیکھتی ہیں جیسے سڑک پر گڑا ہوا کھمبا۔ شاید اسی لئے اس علاقے کی عورتوں کو راں ٹریاں کہتے ہیں۔ بہر حال پلپھی کی عورتیں واقعی راں ٹریاں ہیں اور راں ٹریاں کی ہر عورت ملکہ۔

وہ سرمہ، سیندور اور اخروٹ کے چھلکے کی شوقین ہیں۔ رنگ دار کپڑوں کی دالہ اور خوشبو۔۔۔۔۔۔ خوشبو سے تو انہیں عشق ہے عشق۔ حتیٰ کہ لونگ ابا لے پانی بغیر نہاتی نہیں۔ شاید اسی لئے انہیں راں ٹریاں کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نفیس مزاجی کے باوجود ان کے انداز میں نسائی نمائش نہیں، دعوت نہیں۔ جیسے مندر ہو، مورتی ہو، پوجا کا سامان ہو، سیس نوانے کی آ گیانہ ہو۔

شاید ان کا ”عورت“ کو چھپائے رکھنا تلاش پر مائل کرنے کا انوکھا انداز ہو لیکن راں ٹریاں کے مرد متلاشی دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں جستجو کی بے تابی نہیں بلکہ پالینے کا نشہ ہے۔ وہ عموماً اپنی زمین پر رہتی ہیں۔ انہیں اس پتھریلی زمین کو تسخیر کرنے کا شوق ہے اور اپنی رنگین مگر سنگین راں ٹریاں پر بھروسہ ہے۔

قاسو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آیا تھا۔ ویسے تو بیلی پر سوار ہو کر رات رات میں سو سو میل کا سفر کرنا اس کا شغل تھا، لیکن عموماً پو پھونٹنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جایا کرتا تھا۔ جاکھڑاں کے گرد و نواح میں کون تھا جو قاسو اور بیلی کو نہ جانتا تھا لیکن وہ سب اس کے متعلق اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بہر حال ہر کوئی کوشش کرتا کہ قاسو کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرے۔ آدھی رات کو لوگ بیلی کا ہنہانا سنتے، ٹھٹک جاتے اور پھر معابات ٹالنے کے لئے کوئی موضوع چھیڑ دیتے۔ پو پھنٹنے وقت ہل چلاتے ہوئے کسان قاسو کی تان سن پاتے تو دوسری جانب منہ موڑ کر شدت سے کام میں مصروف ہو جاتے۔ ”تت تا۔۔۔۔۔۔ تت تا“ چلتے ہوئے بیلوں کو ہانکنا شروع کر دیتے۔ عورتیں معنی خیز گانوں سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ڈر کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتیں اور بالآخر مسکرا کر دہی بلونے میں مصروف ہو جاتیں۔

اس روز قاسو اور بیلی نو سار کی جانب آئے۔ بھیلی پورہ کے پاس جہاں سے نو سار کو ڈنڈی نکل جاتی ہے، قاسو نے بیلی کو موڑنے

کے لئے لگام کھینچی لیکن خلاف معمول بیلی اڑ کر کھڑا ہو گیا۔ قاسو نے دوسری مرتبہ اسے موڑا تو وہ بدک کر رک گیا۔ قاسو نے غصے میں ایڑ لگائی۔ تو بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا۔ قاسو نے اسے گردن پر تھپکی دی اور بولا ”اچھا بیلیا! تیری مرضی نہیں تو نہ سہی۔ آج قاسو بیلی کی مرضی پر چلے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے لگام ہاتھ سے پھینک دی اور بیلی ہوا ہو گیا۔ اندھیرے میں قاسو کو معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بیلی اسے واپس لے آئے گا۔ اس لئے وہ بے پرواہی سے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ وہ راں ریاں آ پہنچے۔ بیلی رک گیا اور قاسو نے پگڑی سر تلے رکھی اور سو گیا۔ شام کو وہ جاگا تو اسے بڑی شدت کی پیاس لگی تھی۔ پانی پینے کے لئے خشک درختوں کے اس ویران جھنڈ سے باہر نکلا تو اس بڑھے سے ملاقات ہو گئی۔

”راں ٹریاں۔۔۔۔۔ہوراں ٹریاں“

”کن جاں ژیاں نے کن ماں ژیاں“

یانی عینے کے بعد مونچھ مروڑتا ہوا وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

قاسوڈ یوڑھی سے ہوتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچا۔ ”چودھری!“ اس نے آواز دی۔ ”کون ہے؟“ بدرائے نے سرسری طور پر آواز دی اور چرخہ کا تنے میں لگی رہی۔ قاسو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید سفید بھرے ہوئے ہاتھ میں تاگا اور حرکت میں بے نام سی لچک۔۔۔۔۔ نساہیت کا پتہ دے رہے تھے۔ سر اٹھائے بغیر بدرائے نے دوپٹے کو سر کا کر ماتھا ڈھانپ لیا اور بولی ”کون ہے؟“

”پیارا لگی ہے۔“ قاسم دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ اٹھ بیٹھی ”لسی پیو گے ویر یا دودھ؟“

”لسی“ قاسو نے اس کے ہاتھ کی چوڑیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ ویر“ بدراس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیڑھی ادھر سرکا دی اور گزوا اٹھا چاٹی کے قریب جا بیٹھی۔ اس نے اتنی بڑی چاٹی کو یوں اٹھا لیا گو یا وہ تنکوں کی بنی ہو ”میٹھا گراؤں یا نمک“ کیوں ویر؟“

”نہیں نہیں، نمک نہیں“ وہ چونک کر بولا۔

اجنبی کی آواز میں اضطراب کی جھلک پا کر اس نے آنکھ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نمکنی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بات پر بدراں کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ ”میٹھا ڈال دو؟“ وہ منہ موڑ کر بولی۔

”نہیں“ قاسو نے جواب دیا۔ ”ایسے ہی دے دے۔“

بدرائے نے منہ موڑے بغیر گڑوا ادھر بڑھا دیا۔ دو ایک ساعت وہ یونہی گڑوا لئے کھڑی رہی۔ لیکن اجنبی نے گڑوا نہ پکڑا۔ بدرائے نے مڑ کر دیکھا، وہ حریص نگاہوں سے اس کے کڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ ماتھے کی تیوری اتر گئی۔ ”لے ویر لسی“ وہ بولی۔ گڑوا دے کر وہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور آنکھ بچا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ گڑوے کے کنارے کی اوٹ لے کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔

”پر دیسی ہوویر؟“ بدرائے نے سرسری طور پر پوچھا۔ ”کہیں دور جانا ہے؟“

”نہیں نہیں ادھر ہی کام تھا۔“

”راں ڈیاں میں؟“

”ہاں ہاں یہاں پاس ہی ادھر۔“

”اب روٹی کھا کر ہی جانا ویر“

”روٹی۔۔۔۔۔ نہیں نہیں مجھے جلدی ہے۔“ غناغٹ لسی پی کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”یہ لو۔“ اس نے گڑوا بڑھایا۔

وہ بیٹھی رہی۔ غالباً وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ گڑوا زمین پر رکھ دے لیکن اسے منتظر دیکھ کر بدرائے کو اٹھنا ہی پڑا۔ گڑوا پکڑاتے ہوئے اس نے آخری مرتبہ اس کے کڑوں پر نگاہ ڈالی۔

”پسند ہیں ویر؟“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکا۔

وہ کڑے اتارنے لگی۔ ”یہ کڑے۔۔۔۔۔ میری طرف سے اپنی گھروالی کو دے دینا۔ میری بھابی کو۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تکلیف نہ کرو کڑوں کی کیا کمی ہے۔ گھروالی بھی ہو۔“

”کمی نہیں ویر تو اس کام کا فائدہ؟“

”کون سا کام؟“

”میری مانتو تو یہ کام چھوڑ دو۔“

وہ پھر ہنسا۔ ”ہم ہا کھڑاں والے دان نہیں لیتے۔ ہاتھ کا کمایا کھاتے ہیں۔“ اس نے بازو دکھاتے ہوئے کہا۔

”اسے ہاتھ کا کمایا نہیں کہتے ویر۔“

”اپنا اپنا کام ہے۔ اپنی اپنی بولی۔ تجھے زیادہ فکر ہے تو لا پلا دے نمک والی لسی۔“ اس نے معنی خیز انداز سے کہا۔ ”پھر تو تسلی ہو جائے گی۔“

بدرائ کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ ”میں راس ٹریاں ہوں ویر۔ ہم تسلی نہیں چاہتے، تسلی دیتے ہیں ہم۔ میں نے تجھے ویر کہا ہے میں پھر بھی لحاظ کروں گی تیرا راس ٹریاں میں اور کسی نے تجھے ویر نہیں کہا۔ ٹھہر ذرا۔۔۔۔۔ ادھر آ“ اس نے قاسو کو لکھارا۔ وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بدرائ نے صندوق کھولا۔ ”یہ دیکھ۔۔۔۔۔ یہ چوڑیاں، چوک، ہنسی، تعویذ۔“ اور اس نے کڑے اور ہار اتار کر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ پھر جلدی جلدی قفل لگا کر چابی طاقتہ میں رکھ کر بولی ”یہاں ہوگی چابی۔ اندر والے صندوق سب کھلے ہیں، دروازے کھلے ہوں گے۔ میں وہاں سوتی ہوں، اس پلنگ پر۔۔۔۔۔ اکیلی۔ جب تیرا جی چاہے آ جائیو ویر۔ صرف جاتے ہوئے مجھے جگا دینا۔ پھر اگر تو گٹھڑی باہر لے جائے تو تیری اور اگر تو یہاں آنے سے پہلے کسی اور جگہ یہ کام کرے تو اپنے باپ کا نہ ہوگا۔ سنا تو نے؟“

”عورت کے ساتھ شرط باندھوں؟“ وہ ہنسا

”عورت۔۔۔۔۔“ وہ ہنسی۔ ”یہ راس ٹریاں ہے ویر راس ٹریاں۔“

”راس ٹریاں۔۔۔۔۔ ہوراس ٹریاں“

دور کسی کے گانے کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔ جیسے کسی نے اس کی مردانگی کو لکھارا ہو۔

بدرائ نے سر اٹھایا اور یوں تن کر کھڑی ہو گئی جیسے لڑائی کا ڈھول سن کر بولی ”سورما! جب تیرا جی چاہے آ جائیو۔“

دیوار پھاندنے سے پہلے اسے خیال آیا۔ بھلا آزمائش تو سہی۔ کیا وہ سچ کہتی تھی۔ کیا واقعی دروازہ کھلا ہے اور وہ دروازے کی طرف چلا۔ اف کس قدر اندھیری ہے یہ رات۔ اس نے سوچا۔ آخر عورت ہے نا۔ مسکرا کر اس نے پٹ پر انگلی کا دباؤ دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہوں۔۔۔۔۔ کتنا ہوگا۔ کتنا۔۔۔۔۔ اوہ پھر مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ آہٹ کرنے کے باوجود کوئی آواز نہ آئی۔ اونہوں۔۔۔۔۔ اس نے سر ہلایا۔ طاقتہ پر دیا ٹمٹمار با تھا۔ پلنگ پر چادر لپیٹے وہ سو رہی تھی۔ اس کے علاوہ مکان خالی پڑا تھا۔ دیئے کے پاس صندوق کی چابی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔

گٹھڑی باندھ کر وہ بدرائ کے سر ہانے آ کھڑا ہوا۔ فضول بے آرام کرنا۔۔۔۔۔ اس نے سوچا۔ جگا بھی دوں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ معا سے خیال آیا کہ وہ کس قدر نڈرتھی۔ ورنہ یوں بے فکر گہری نیند میں پڑے رہنا آسان کام نہیں۔

قاسو نے بدراس کی بائیں کلائی پکڑ کر اسے بلایا۔ بدراس نے کروٹ بدلی لیکن اس کی آنکھ نہ کھلی۔ دوبارہ قاسو کے جھنجھوڑنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ساعت کے لے جوں کی توں پڑی رہی۔ پھر اس نے لپک کر دائیں ہاتھ سے قاسو کی کلائی پکڑ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بولی ”اب اگر تو کلائی چھڑالے تو وہ گٹھڑی تیری ہے۔“

وہ ہنس پڑا اور بے پرواہی سے ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا دیا۔ لیکن بدراں کی گرفت اور بھی آہنی ہو گئی۔ ابھی وہ دوسرا جھٹکا دینے کی سوچ رہا تھا کہ بدراں نے کلائی مروڑ کر اسے چار پائی پر گرا لیا۔ ”آرام سے بیٹھ کر ویر۔“ وہ بولی ”لے اب چھڑا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کلائی پکڑ کر کہا۔

قاسو غصے سے آگ بگولا ہو گیا لیکن بدراں کی گرفت بلا کی تھی۔

ایک بار پھر وہ چلائی۔ قاسو نے دوسرے ہاتھ سے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس بات پر وہ بھوکی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی۔

”افسوس ہے کہ میں نے تجھے دیر کہا ہے ورنہ۔۔۔۔۔“ اس نے قاسو کو دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش کھڑا رہا۔

”میں تو تجھے آزما رہا تھا۔“ قاسم نے اپنا انداز بدلا۔

”تو آ زما دیکھا۔“ وہ اکثر کہتی تھیں۔

”تو نے مجھے دیر کہا ہے۔“ وہ مسکرایا

”ہاں“ وہ بولی ”ورنہ۔۔۔۔۔۔“

بیلی کے ہنہانے کی آواز سن کر وہ چونکا۔ ”اچھا میں جاتا ہوں۔“

”قول دے پہلے۔“ وہ مسکرائی۔

”اونہوں۔۔۔۔۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مجھ سے نبھایا نہ جائے گا۔“

”اچھا“ وہ سوچ کر بولی ”نہ سہی“

”ادھر نہ آؤں گا، کبھی راس ٹریاں کو۔“

”تو دودھ پی کر جا۔“

”ضروری ہے کیا؟“

”ہاں“ وہ بولی ”یا قول دے یا دودھ پی کر جا، یہاں کی ریت ہے۔“

”اچھا“ وہ بیٹھ گیا ”لا دودھ“

بدراں اٹھ کر کاڑھنی کی طرف چلی۔ ڈول میں دودھ ڈالا۔ پھر اندر جا کر شکر تلاش کرنے لگی۔ شکر کے علاوہ دودھ میں سبز سا سفوف گھول کر لے آئی۔ قاسونے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

”اؤنہوں زہر نہیں۔“ وہ بولی ”ویر کو زہر نہیں دیتے۔“

”اچھا! راس ٹی“ وہ بولا ”جو چاہے دے دے اب کیا ہے۔“ اور غنا غٹ پی گیا اور پھر ”اللہ بلی“ کہہ کر وہ صحن کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

جا کھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے۔ پھر دہلی دہلی باتیں شروع ہو گئیں۔ کسی نے کہا ”میں کہتی ہوں تم نے سنا کچھ؟ اب تو بیلی ساری ساری رات گلیوں میں جھنہتا رہتا ہے۔“ کوئی بولی ”اچھا نہ ہوگا“ اللہ مارا“ تیسری نے کہا ”اوں۔۔۔۔۔ اچھا نہ ہوگا“ بھلا چنگا پھرتا ہے۔“

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ پھر کوئی بول اٹھتا ”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو بگلی چلا رہی ہے۔ صبح سویرے پو پھونٹنے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر دارے میں جا کر چمگیوں کیا کرتے۔“ چھوڑ دیا اپنا کام۔ بھی اللہ ہی جانے۔ کہتے ہیں رات بھر پیر جیلانی کے روضہ پر سویا تھا۔“ ”بس یہ تو پیسے کی کی تو نے“ اجی بڑی کرا متے والے ہیں وہ۔“

ہر جگہ قاسو کی بات چٹھڑ جاتی۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر نکلتا۔ قاسو کے متعلق پہلے جس قدر چپ رہتے تھے، وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو۔ یا شاید اسے یہ شکایت تھی کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی۔

”لیکن آخر تھا کیا اس دودھ میں؟“ ماجو نے پوچھا۔

”معلوم نہیں“ قاسو نے آہ بھر کر کہا۔ ”جب سے بدن میں جا نہیں ہمت نہیں رہی۔“

”ہمت نہیں رہی؟“

”ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے۔“ وہ ہر خند ہمیں ہنسا۔

”کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟“

”اس سے بھی بدتر۔“ قاسو نے شرم سے سر جھکا لیا۔

”قاسو۔۔۔۔۔؟“ ماجو حقیقت حال جان کر چلایا۔

”ہاں ماجو“ قاسویوں خاموش ہو گیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

”لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ کیا تم نے اس پر ہاتھ۔۔۔۔۔۔؟“

”اؤںہوں“ وہ بولا ”میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا۔“

”پر کیوں؟“

”پتہ نہیں“

”تعب ہے تمہیں ایسا بنادینے سے اسے کیا ملا۔ حرام زادی۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔“ دفعتاً وہ رک گیا اور

خاموش ہو رہا۔

اس وقت ماجو کے دل میں ایک خاموش جذبہ پرورش پانے لگا۔ کوئی ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ دن بھر کھیت پر کچھ کام نہ کر سکا۔ پھر وہ مادو قصائی کے پاس جا بیٹھا اور تفریحاً ایک چھری تیز کرنے لگا اور

گھر آتے ہوئے ان جانے میں چھری ہاتھ میں لئے چلا آیا۔ ”اؤںہوں۔۔۔۔۔۔“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ”یہ چھری“ اس نے

چھری کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ چھری کام نہ آئے گی۔“ اور وہ مادو کی طرف لوٹا۔ چھری لوٹانے گیا تو مادو سے پوچھنے لگا۔ ”مادو کوئی ایسی

چیز ہے کیا جو کسی کو بے ہوش کر دے۔“

”کیوں؟“ مادو نے پوچھا۔

”ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“

”صمدو کے پاس ہے۔ صمدو نائی کے پاس۔“ مادو بولا ”فوراً بے ہوش ہو جائے بس سو گھننے کی دیر ہے۔“ ”کیا چیز ہے؟“ اس

نے پوچھا ”پتہ نہیں۔“ مادو نے کہا ”سرکاری چیز ہے کوئی۔ دوا خانے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے صمدو“

رات کو چار پائی پر پڑے پڑے نہ جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔ اور پھر خواب میں ایک اونچی لمبی عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اور وہ

غصے میں اپنے بھائی قاسو سے کہہ رہا تھا ”یہی ہے نا وہ؟“

اور قاسوم نہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جاگ اٹھا۔ ”جاؤں گا۔۔۔۔۔ ضرور جاؤں گا۔“

اندھیرے میں دبے پاؤں سرک سرک کر وہ بدراں کے مکان کے دالان تک جا پہنچا۔ سامنے پنگ پر کوئی سویا ہوا تھا۔ اس نے ایک بڑی سی ڈیالہنگے کے پلہ سے نکالی۔ اسے مضبوطی سے تھام کر وہ پھر چوپائے کی طرح چلنے لگا۔ چار پائی کے پاس پہنچا تو بدراں نے کروٹ لی۔ ماجو چار پائی تلے چھپ گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے سر باہر نکالا۔ بدراں دائیں پہلو پر یوں لیٹی تھی کہ اس کی ناک چار پائی کے سرے کے قریب تھی۔ وہ سرک کر قریب ہو بیٹھا اور ڈبیہ کھولنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ وہ ڈھکنا کھولتا۔ اس کے دونوں ہاتھ بدراں کی گرفت میں تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ بیٹھی۔ ”مجھے معلوم تھا تو آئے گا۔“ لیکن ماجو کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھنکی۔ ”تو۔۔۔۔۔ تو کون ہے؟“ وہ بولی ”اؤںہوں۔۔۔۔۔“ اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر گنگنائی۔ ”چوری کرنے آیا تھا کیا؟ کر لے چوری کس لئے آیا تھا تو؟“ بدراں نے پوچھا۔ ماجو کو جوش آ گیا۔ بولا ”تیرے لئے۔“

”میرے لئے؟“ وہ حیران ہو گئی۔

”ہاں تجھے لین کے لئے۔“ اس نے دانت پیسے۔

”تو“ بدراں نے نفرت سے ہونٹ نکالے ”اپنی جان کی خیر نہیں کیا؟“

”اؤںہوں“ ماجو نے نفی میں سر ہلا دیا ”ایک روز مرنا تو ہے ہی۔“

”حرام موت“

”نہیں حرام کیوں نہ چلے گی میرے ساتھ تو تجھے مار ڈالوں گا۔ آپ مر جاؤں گا۔“

”بڑا بہادر ہے تو؟ پر یہ ڈبیا کیا ہے۔۔۔۔۔ ہوں؟“

”کچھ ہے ہی نا“

”زہر ہے کیا؟“

”زہر۔۔۔۔۔؟“ وہ مسکرایا۔

”تو پھر؟“ وہ بولی

”دوائی ہے اور کیا“

”دوائی؟“

”ہاں تجھے بے ہوش کرنے کو۔۔۔۔۔ تو سونگھ لیتی تو میں کب سے تجھے اٹھا کر چل دیتا۔“

”اچھا مجھے بے ہوش کر کے لے جانا تھا تو نے“ بڑا بہادر مرد ہے۔“ بدرائے نے اسے دیوار پر دے چٹخا۔ ماما جو کھسیانا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”بس یہی ہمت ہے تیری۔ گھر سے راں رڑی لینے آیا تھا۔ ہمت بھی ہے تجھ میں۔“

”نہ سہی“ وہ بولا ”خواہش تو ہے۔“

”تیرے جیسے تو ہمارے کمین ہیں، کمین۔“ وہ غرائی۔

”کمین ہی سہی۔“

”چل دفعہ ہو۔“ وہ بولی ”دور ہو جا یہاں سے جاتا ہے یا نہیں۔“ بدر اں نے اسے پھر دھکا دیا اور وہ دبلیز پر گر پڑا۔ منہ پر خراش

آئی لیکن جلد ہی سنبھل کر اٹھ بیٹھا۔

”جائے گا یا نہیں؟“ وہ پھر غرائی۔

”اچھا“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”پھر سہی“

”تو۔۔۔۔۔“ وہ غصہ سے چلائی اور اسے پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”کون ہے؟“ پڑوس سے دتا بھاگتا ہوا اندر آیا۔ ”کون ہے بدراں؟“

”کون ہے یہ؟“ دتے نے ماجر کو دیکھ کر بدرائے سے پوچھا۔

”پتہ نہیں“ وہ بولی

”چور ہے؟“ دتے نے پوچھا۔

”پوچھو اس سے کہتا ہے تجھے لینے آیا ہوں۔“ وہ ہنسی۔

“ॐ”

“ہاں”

”حرام خور۔۔۔۔۔“ دتے نے اسکی گردن پر ایک دی۔ اور وہ چکرا کر بدراں کے پاؤں میں آگرا۔

”یا گل ہے کوئی۔“ وہ بولی۔

”خون پی لوں گا اس کا۔۔۔۔۔ میں“ دتا ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

ماجو بدراں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ اور یوں اس کا دامن کھینچنے لگا، گویا ماں بچے سے پناہ مانگ رہا ہو۔ ”دے!“ بدراں چلائی ”تو کچھ نہ کہہ اسے میں کر لوں ٹھیک۔۔۔۔۔ دے“ وہ پھر چیخی لیکن دتے نے ایک اور لگائی اسے اور وہ چیخا ”راں ٹی“ ماجو نے اعلانیٰ اس سے پناہ مانگی۔ ”رہنے دے بہادری تو“ وہ دتے کا ہاتھ پکڑ کر بولی ”تو جا“ اس نے دتے کو دروازے کی طرف دھکیلا اور خود رسی لے کر ماجو کو باندھنے لگی۔ یہ دیکھ کر دتا ہنسا بولا ”اچھا جیسے تیری خوشی۔“

”کہتی جو ہوں پاگل ہے کوئی۔۔۔۔۔ سر پھرا۔“

دتا ہنسا اور باہر نکل گیا۔ اسے بندھا ہوا دیکھ کر بدراں کی ہنسی نکل گئی۔ ”مجھے لے جانے کا خط نہیں گیا۔“

”اب تو باندھ دیا ہے مجھے تو نے۔“ ماجو بولا ”بندھے ہوئے کو باندھنے میں بڑی بہادری ہے۔“ اس نے دکھلاوے کی محبت

جتائی۔

”اوہ“ وہ ہنسی اور اسے کھولنے لگی ”اچھا اگر میں سونگھ لیتی اسے تو کیا ہوتا؟“ اس نے ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

”بے ہوش ہو جاتی تو۔“

”پھر؟“

”پھر میں گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا تھجے۔“

”سچ“ وہ بولی ”پھر؟“

”پھر۔۔۔۔۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”بس“ لیکن عین اس وقت اسے سوچھی۔ ”تو نے میرے بھائی کو نہ جانے کیا پلا دیا ہے۔ اس میں

ہمت نہیں رہی۔ اب سارا گاؤں دشمن ہے۔ ہم کیا کریں؟“

”اچھا“ وہ بولی ”تو اس کا بھائی ہے؟“

”ہاں“ وہ بولا ”جب سے قاسو نے کام چھوڑا ہے۔ سبھی دشمن ہو رہے ہیں۔“

”میں وہاں چلی جاتی۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوتا؟“ وہ بولی۔

”پھر۔۔۔۔۔ پھر ہمیں کیا پرواہ تھی۔“ وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔ ”تو چلی جاتی تو کسی کو ہم پر ہنسنے کی جرات نہ ہوتی۔“

”اچھا“ وہ مسکرائی۔ ”کیا اس ڈبیہ کو سونگھ لیتی تو واقعی بے ہوش ہو جاتی؟“ اس نے ڈبیہ سے کھیلے ہوئے کہا اور کھیل ہی کھیل میں

اسے کھول کر ناک کے قریب لا کر بولی ”دیکھوں۔۔۔۔۔۔ ہائے میں نہیں دیکھتی۔“ وہ رک گئی۔ ”ہائے بے ہوش ہو گئی تو تم لے جاؤ گے۔۔۔۔۔۔ لے جاؤ گے نا؟“ وہ ہنسی۔ ماجرہ خاموش بیٹھا رہا۔

”تلخ سی بو ہے۔“ اس نے ڈبیہ کو تاک کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ ”اوئی“ ایک چیخ سی سنائی دی اور بدراں دھڑام سے مارجو کے پاؤں پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ مارجو حیران کھڑا دیکھ رہا تھا۔

دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ کہیں کوئی گارہا تھا۔

دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ کہیں کوئی گارہ تھا۔

”راں ٹیاں۔۔۔۔۔ہوراں ٹیاں“

”کن جاں ٹریاں تے کن ماں ٹریاں“

”رااں ٹیاں۔۔۔۔۔!“



ہائے یہ نوجوان

اس روز چودھری غلام حسین کے گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

ایک طرف بند کمرے میں میاں بیوی اور خالہ منور سرگوشیاں کر رہے تھے دوسری طرف ملحقہ کمرے میں فرخ بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پیشانی پر تیوری چڑھی تھی۔ ہنٹھے پھولے ہوئے تھے اور مٹھیاں بند تھیں۔ وہ ان جانے میں گھونے چلاتا ہوا کمرے میں یوں گھوم رہا تھا جیسے پنجرے میں شیر ہو۔ اس کے پاس آصفہ بیٹی کچھ بن رہی تھی۔ کان ملحقہ کمرے میں سرگوشیوں پر لگے تھے۔ ہونٹوں پر زیر لب مسکراہٹ تھی۔ لطیف تمسخر گالوں کے گڑھوں سے نمایاں ہو رہا تھا۔ آصفہ امی ابا اور خالہ کی سرگوشیاں سنتی ایک نظر بھائی کی طرف دیکھ کر مسکراتی جو پاس ہی عالم بے بسی میں ہوا کو گھونے مار رہا تھا۔ کچھ گنگنائی اور پھر الجھی ہوئی لٹ ہٹا کر از سر نو کان دیوار سے لگا کر بننے میں مصروف ہو جاتی۔

بند کمرے سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ پہلے تو سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ پھر اگرچہ باتوں کا اندازہ راز دارانہ رہا۔ مگر وہ سب اس قدر بلند آواز میں بولنے لگے جیسے اس راز کو اچھا لانا چاہتے ہوں۔

پہلے تو خالہ منور اور آصفہ کی ماں کی روئی روئی آوازیں سنائی دیں پھر کوئی سسکیاں بھرنے لگی اور غلام حسین منتیں کرنے لگے۔ جیسے سمجھا بھجار ہے ہوں۔ دلا سے دے رہے ہوں۔ پھر خالہ منور کی سسکیاں مدھم پڑتی گئیں۔

آصفہ کی ماں کی آواز بھی سن بھلتی جا رہی تھی۔ اور اس کی باتوں میں تسلسل پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر غلام حسین کی آواز میں منت کا عنصر خارج ہونے لگا۔ جیسے دفعتاً انہیں اپنے وقار کا خیال آ گیا ہو۔ ان کے لہجے میں کڑنگی پیدا ہونے لگی۔ اور ان کی آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ بیگم کی بات کاٹنے کی ناکام کوشش میں لگے تھے۔ کیونکہ بیگم کے روبرو ان کی کوششیں جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بیگم یوں بولے جا رہی تھی جیسے ویرانے میں ندی بہہ رہی ہو۔ عادی طور پر اسے کہنے سے غرض تھی۔ سننے سے نہیں۔

ملحقہ کمرے میں آصفہ یوں بیٹھی تھی۔ جیسے اسے بات سننے میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس کے باوجود بند کمرے کی سرگوشیوں کی تال پر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر ان دھڑکنوں کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کندھوں پر مائلے کا رنگ کا ہلکا دوپٹہ بے پرواہی سے لٹک رہا تھا۔ جس میں سفید پھول چمک رہے تھے۔ شگرفی ناخنوں پر سفید دھاگہ لپٹ کھل رہا تھا۔ نگاہیں اگرچہ سفید

سینڈل کی نوک پر ٹکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر وہ کنکھیوں سے بھائی فرخ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا کر یوں ہونٹ ہلا رہی تھی۔ جیسے کچھ گنگنارہی ہو۔ فرخ کو اشارتا کچھ سمجھا رہی ہو۔

”ج لے اے اے اے بنراج لے“

آصفہ کو گیتوں اور ٹھمریوں کے بول بے حد پسند تھے وہ کہا کرتی ہائے امی کتنے پیارے بول ہیں جیسے دل سے نکلے ہوں۔ اور امی ہاتھ چلا کر کہتی تو تو پاگل ہو گئی ہے لڑکی واہی تباہی نہ بکا پر۔ اور جب آصفہ اس کا جواب دینے لگتی تو امی ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیتی چپ کر اب۔ آصفہ ہنسے جاتی۔

غلام حسین کے گھر میں بچوں کو کافی آزادی حاصل تھی اور یہ سب امی کی طبیعت کی وجہ سے تھا۔ اگرچہ میاں کے ساتھ اس کا برتاؤ سخت غیر قسم کا تھا۔ مگر بچوں کے ساتھ وہ اکثر بچہ بن جاتی۔ جب غلام حسین باہر چلے جاتے تو ماں چپکے سے آصفہ کے پاس آ بیٹھتی۔ ”کیا کر رہی ہو میری آسو“ وہ پیار سے کہتی۔ آصفہ کی زیر لبی مسکراہٹ ہونٹوں سے نکل کر گالوں پر پھیل جاتی۔ ”کیا گنگنارہی ہے تو؟“ ماں پوچھتی۔ ”اے ہے منہ ہی منہ میں گنگناتی ہے۔ ذرا اونچی آواز سے کہہ تو کیا بول ہے۔“ کچھ نہیں امی“ آصفہ منہ پکا کر لیتی۔ ”اے ہے کہہ تو سہی“ ایک بار۔ تو بہ تو تو خنجرے کرتی ہے۔ کیا ہے وہ ڈیرے والا گیت۔ اس پر صادقہ چلائی۔ امی میں بتاؤں۔ مانڈے ڈیرے آجا۔ ہاں وہی۔ ماں کی باجھی کھل جاتیں۔ ”مانڈے ڈیرے آجا سنا دے۔“

آصفہ ہنستی۔ ”امی وہ تو ڈیرے پر ہی ہیں پھر بلانے سے فائدہ؟“

”چل دور ہو۔“ ماں ہنس کر گھورتی۔ ”ہر بات کا مذاق اڑاتی ہے۔ شرم نہیں آتی۔“ آصفہ گیت سنانے لگتی تو صادقہ سلیٹ رکھ کر ٹکلی باندھ کر آصفہ کی طرف دیکھتی۔ آصفہ کے چہرے پر ایک پر کیف اداسی جھلکتی۔ صادقہ کا دل چاہتا کہ آ پگاتی رہے اور وہ اسے دیکھتی رہے۔ اس وقت آصفہ کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا گویا واقعی کوئی ڈیرے کی طرف آ رہا ہے۔

ایسے وقت فرخ آ جاتا تو وہ چھپکر اس کا گانا سنتا رہتا اور اپنی آمد اظہار نہ کرتا۔ پھر جب گانا ختم ہو جاتا تو وہ بھدی آواز میں مینڈک کی طرح ٹرانے لگتا۔ اس پر آصفہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتی۔ ہائے امی یہ مینڈک کیوں ٹرانے لگے۔ ابھی تو برسات نہیں آئی اور فرخ چلاتا اور کیا ہر وقت کو علیا ہی کو کہتی رہے۔ مینڈک کو ٹرانے کا حق نہیں کیا۔ ”ہائے بھائی جان صادقہ سلیٹ اٹھا کر منہ بناتی۔ سارا مزا کر کر کر دیا۔“ میں کہتی ہوں ماں ہاتھ چلا کر کہتی۔ سارا دن گھر میں ہی گھسار رہا ہے۔ کبھی باہر بھی جایا کر۔ واہ ماں وہ غصے میں گھونسا چلاتا۔ مجھے تو باہر جانے کو کہتی ہو اور اپنی لاڈلی سے ”مانڈے ڈیرے آجا“ سنتی ہو۔ تو بہ ماں ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی۔ ”کیسے

منہ پھٹ ہو تم جو منہ میں آیا بک دیا۔“

”میں بتاؤں امی“ صادقہ چلانے لگتی۔ اصل میں بھائی کو یہ گیت پسند نہیں۔ ان کو تو یہ شکایت ہے کہ ان کی پسند کا گیت کیوں نہیں گایا جاتا۔

”میں بتاؤں امی“ آصفہ مسکراتی اور پھر گانے لگتی۔

”ج لے لے اے اے اے بنراج لے“

اور فرخ اس کا منہ چڑانا شروع کر دیتا۔ بڑی گویا تو دیکھو۔ ہونہ!

یہ دلہن اور بنرا سجنے کی بات بھی بہت پرانی تھی۔ بہن اور بھائی دونوں کو شادی کے نام سے چڑھتی۔ فرخ رشتہ داروں میں ناٹھ کرنے کے خلاف تھا اور آصفہ شادی کرنے سے ہی منکر تھی۔ گھروں میں بچوں کے بیاہ شادی کی بات ہوا ہی کرتی ہے۔ آصفہ کی شادی کی بات چھڑ جاتی تو فرخ دوڑ کر اس میں جا حصہ لیتا اور بات کو ہوا دیتا اور پھر چوری چوری آصفہ کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ فرخ کے بیاہ کا ذکر ہوتا تو آصفہ چپکے سے ان کے پاس آ بیٹھتی۔ ہائے اماں خالہ منور کی بیٹی رعنا کی سی لڑکی تو ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ اس پر فرخ دانت پیستا اور غصے میں ہوا میں گھونسنے چلاتا۔ لیکن آصفہ گویا اپنی دھن میں بات کئے جاتی جیسی فرخ کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

ادھر فرخ بھی موقع کے انتظار میں رہتا تھا۔ موقع ملتا تو جھٹ رشتہ داروں میں شادی کرنے کی قبیح اثرات پر لیکچر جھاڑنے لگتا۔ اماں بات سمجھے بغیر ہی ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی کیا واقعی رشتہ داروں میں شادی کرنا برا ہے فرخ۔ اس پر فرخ فاتحانہ انداز سے آصفہ کی طرف دیکھتا جو چپ چاپ بیٹھی بننے میں مصروف ہوتی اور فرخ تفصیل سے ماں کو بات سمجھانے لگتا۔ اور جب فرخ کو یقین ہو جاتا کہ اس نے اس مسئلے پر پورے طور پر روشنی ڈال دی ہے اور ماں اس کی بات کو مکمل طور پر سمجھ چکی ہے۔ تو آصفہ چپکے سے کہتی۔ امی عزیزوں میں شادی نہ ہو تو کیا غیروں میں ہو۔

”اللہ تیرا بھلا کرے ماں“ جھٹ بول اٹھتی یہی تو میں سوچ رہی تھی۔ آخر خدا رسول نے جائز کی ہے رشتہ داروں میں شادی“ فرخ کا بنایا ہوا قلعہ دھڑام سے زمین پر آ رہتا۔ اور وہ دانت بھیج کر ہوا میں مکے مارنے لگتا۔ لیکن آصفہ چپ چاپ بننے کے کام میں مجبور ہتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

لیکن اس روز جب گھر والوں نے پہلی مرتبہ سب ری دلہن سا بے کا بول سنا تھا۔ اس روز حالات مختلف تھے۔ ماں نے برسبیل

تذکرہ آصفہ کے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ اسے بھی تو ان دونوں سے الجھنے میں مزا آتا تھا۔ آصفہ بیاہ کی بات سن کر غصے میں لال ہو گئی۔ بولی۔ ”دماغ چل گیا ہے؟ ہر وقت بیاہ کی بات۔۔۔۔۔ کوئی اور بات سوچتی ہی نہیں۔ عین اس وقت فرخ گھر میں داخل ہوا اس نے ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا کہ بات کیا تھی۔ دفعتاً اسے یاد آیا کہ جب وہ بازار سے گزر رہا تھا تو کوئی ریڈیو پر گانا گارہا تھا جو عین موقع کی چیز تھی۔ اس نے چپکے سے ریڈیو کا بٹن کھول دیا۔

آخر کسی روز دلہن بننا ہی ہے تمہیں۔ اماں بولی۔

آصفہ نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو کر ہال بنانے لگی عین اس وقت ریڈیو چننے لگا۔

”سج لے دلہن سج لے“

اور فرخ تالی بجانے لگا۔ واہ واہ واہ کیا گیت ہے۔“

آصفہ یہ سن کر تڑپ کر مڑی اور پھر کنگھی پھینک کر سنگھار میز سے دور ہو گئی۔ جیسے اسے سچے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

فرخ اپنی ہی دھن میں چلاتا رہا۔ واہ واہ کیا گیت ہے سج ری دلہن سج لے۔ واہ واہ۔۔۔۔۔ صادقہ آج تو کمال ہو گیا۔ واہ

واہ واہ!

پھر چند دنوں بعد جب ماں باپ بیٹھے فرخ کے بیاہ کی بات کر رہے تھے اور فرخ اپنے کمرے میں شیو کرتے ہوئے ان کی باتیں سن کر چپیں بجھیں ہو رہا تھا تو آصفہ دبے پاؤں فرخ کے کمرے میں گھس گئی اور ادھر ادھر یوں گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ پھر اس نے گنگنا شروع کر دیا۔

”سج لے بھرا سج لے“

فرخ نے آصفہ کی طرف دیکھ کر غصے سے مکا چلایا۔ مگر آصفہ یوں معصومیت سے بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بھائی جان میری پنسل تو نہیں دیکھی۔ آپ نے اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہی گیت گنگنا تے ہوئے پھر تلاش میں مصروف ہو گئی۔

دوڑ جا یہاں سے فرخ غصے میں چلایا۔ اور وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور وہ دونوں میز کے گرد دوڑنے لگے۔ یہ ”سج لے“ کا مذاق بہت

پرانا تھا۔

لیکن اس روز تو حالات بہت ہی بگڑے ہوئے تھے۔ گھر میں سبھی جانتے تھے کہ بند کمرے میں فرخ کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے۔ حالات کی سنجیدگی کو مد نظر رکھ کر آصفہ کو بھی جرات نہ ہوئی کہ با آواز بلند گنگنائے اس لیے وہ دیوار کے پاس بیٹھی ہوئی مسکرا رہی

آج کل ہوتا ہی کیا ہے۔ انہوں نے تو بڑے بڑے رشتے رد کر دیئے ہیں ہاں!

فرخ نے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کی۔ دیواریں دھندلی پڑ گئیں۔ وہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا چلو مخلصی ہوئی۔ جان بچی سولا کھوں پائے۔ اس نے خوشی محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ”وہ مارلیا میدان“ وہ آصفہ کے سامنے چٹکی مار کر چلایا۔ ”وہ مارلیا“ لیکن اس کے باوجود اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو۔ جیسے اس کا مذاق اڑایا گیا ہو۔

آصفہ کی مسکراہٹ کا فور ہو گئی اس کے ہاتھ رک گئے اور انگلیاں بے جان ہو کر لٹکنے لگیں۔

اور پھر تم سے کیا پردہ ہے بہن خالہ منور کی آواز پھر سنائی دی۔ اپنی رعنا کے عجیب سے خیالات ہیں۔ نہ جانے آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہوا ہے۔ الٹی الٹی باتیں سوچنے لگے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں بہن مجھے تو شرم آتی ہے بات کرتے ہوئے۔ رعنا کہتی ہے مجھے رشتہ داروں میں شادی کرنا پسند نہیں۔ لو کبھی سنی تھی ایسی بات۔

فرخ نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور خالی الذہن ہو کر چھت کو گھورنے لگا۔

آصفہ اٹھ بیٹھی جیسے کھو گئی ہو۔

”میری بات کا یقین نہ ہو۔“ خالہ منور بولی۔ ”تو رعنا کے ابا سے بات کر دیکھو آج ہی آرہے ہیں وہ“

”آج آرہے ہیں۔“ آصفہ کی ماں کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”ہاں“ منور بولی۔ ”سبھی آرہے ہیں۔ رعنا حسن آرا کبر اور جمیل سبھی۔ مگر وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔“

”یہاں نہیں ٹھہریں گے؟“ ماں نے دہرایا۔

”ایک دو دن کی بات ہوتی تو وہ یہیں آ پڑتے پورے دو مہینے یہاں رہنا ہے۔ پچھواڑے میں مظفر علی کے گھر کی اوپر لی منزل کا

انتظام کر لیا ہے۔ مظفر علی کا بھائی کراچی گیا ہوا ہے۔ جگہ خالی پڑی ہے۔ تم جانتی ہو مظفر علی ان کے چچا زاد ہیں۔“

”اچھا تو میں چلتی ہوں اب ذرا جگہ ٹھیک ٹھاک کرادوں۔“

خالہ منور کے جانے کے بعد غلام حسین کے گھر پر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ آصفہ کی ماں چپ چاپ چولہے کے پاس جا

بیٹھی۔ غلام حسین اندر حقے سے غم غلط کرنے لگے۔ آصفہ خاموش چار پائی پر جا پڑی اور فرخ کتاب پڑھنے کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔

شام کے وقت فرخ مال روڈ پر گھومتے ہوئے اس مخلصی پر خوشی محسوس کرنے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ چلو ایک خالہ زاد سے تو جان